قرآن و سنّت میں اخلاق

ڈاکٹر محمد عبد الحق انصاری ۱؎

قرآن وسنت کی نظر میں زندگی دو مرحلوں میں منقسم ہے، مگر دونوں مرحلے ایک دوسرے کے ساتھ بے حد مربوط ہیں۔ ایک موت سے پہلے کا مرحلہ اور دوسرا موت کے بعد کا۔ بلاشبہ موت ایک عظیم تغیر ہے۔ لیکن زندگی موت پر ختم نہیں ہوتی۔ دوسری زندگی یقیناً ایک نئی زندگی ہوتی ہے لیکن پہلی زندگی کے نہ منافی ہوتی ہے اور نہ اس سے یکسر مختلف۔ دراصل زندگی ایک وحدت اور ایک تسلسل ہے۔ اس وحدت و تسلسل کا تقاضہ ہے کہ زندگی کا خیرِ اعظم نہ صرف اس دنیا سے متعلق ہو اور نہ محض اُس دنیا سے بلکہ دونوں کی بھلائی پر حاوی ہو۔ قرآن مجید نے اہلِ ایمان کو جو تعلیم دی ہے، وہ یہ ہے:

ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃً و فی الآخرۃ حسنۃً وقنا عذاب النار (۲:۲)	اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرمائیے اور آخرت میں بھی۔ اور ہم کو آگ کے عذاب سے محفوظ رکھیے۔

اس تعلیم کا یہ تقاضہ ہے کہ دنیا کی بھلائی کو آخرت کی بھلائی کا محض ذریعہ قرار نہ دیا جائے بلکہ اس کو بذاتِ خود مقصود سمجھا جائے۔ اسلام نے خیر کا جو تصور پیش کیا ہے، دنیا کی فلاح اس کا جزو لاینفک ہے۔ قرآن وسنت میں زندگی کے مختلف پہلوؤں (سماجی، معاشی اور سیاسی) کی تعمیر و اصلاح کا جو اہتمام ملتا ہے، وہ اس حقیقت پر شاہد ہے۔ اسلامی آئیڈیل کسی ایسے فرد کا آئیڈیل نہیں ہے، جو

۱؎ مجلۂ علومِ اسلامیہ (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کی جلد ۴ شمارہ ۱ سے

سماج سے الگ رہتا ہو بلکہ ایسے فرد کا ہے جو سماج کا فعال اور سرگرم کارکن ہے۔ انسان کی ذاتی زندگی اور سماجی زندگی دونوں قرآن وسنت میں ایک کُل سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن وسنت کا تصورِ فلاح انفرادی ہی نہیں بلکہ سماجی بھی ہے۔ حیاتِ دنیا میں سماج کی جو اہمیت ہے، وہ تو ہے ہی، آخرت کی زندگی کا نقشہ بھی جو قرآن وسنت میں ملتا ہے، وہ بالکل انفرادی نہیں ہے بلکہ ایک طرح کی سماجی زندگی ہے [۱] اسلام میں جو اہمیت سماجی تعلقات، جماعتی فرائض، اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور جہاد کو حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اسلام کا خیر کا تصور اجتماعی ہے۔ سماج سے گریز یا اجتماعی فلاح سے بے تعلقی ایک جرم قرار دیا گیا ہے۔ اس کی اجازت صرف ان انتہائی حالات میں دی گئی ہے جن میں دینی فرائض وارکان کی ادائیگی ناممکن ہو جاتی ہے۔ مگر ایسے حالات میں بھی ظلم وفساد کے خلاف جہاد کو رسول اللہؐ نے ہمیشہ عزیمت ہی قرار دیا ہے [۲]

اگرچہ دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی فی نفسہٖ مقصود ہے لیکن دنیا کی بھلائی کو آخرت کی بھلائی کے مقابلہ میں ترجیح حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ فلاح دنیا فی نفسہٖ مقصود نہیں ہے بلکہ یہ

---

[۱] قرآن مجید واضح طور پر بتاتا ہے کہ ایک خاندان کے افراد، آباء، ابناء اور ازواج جنت میں ایک ساتھ رکھے جائیں گے بشرطیکہ وہ صالح ہوں (۱۳ : ۲۳، ۴۰ : ۸ - ۵۲ : ۲۱)۔ قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ رفقاء اور اصحاب اجتماعی طور پر رہیں گے۔ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف کوئی بغض نہ ہوگا، ایک دوسرے کو تحیات پیش کریں گے (۱۵ : ۴۵ — ۴۷) ان کا معاشرہ برائیوں سے پاک اور باہمی الفت اور محبت سے سرشار ہوگا (۷ : ۴۳، ۵۶ : ۲۵-۲۶، ۱۰ : ۱۰) چونکہ جنت کی زندگی مثالی زندگی ہوگی۔ لازم ہے کہ اس میں انسان کے سماجی جذبات کی تسکین کا موقع ہو۔

[۲] اس مفہوم کی حدیثیں بہت ہیں۔ یہاں صرف ایک حدیث نقل کی جاتی ہے۔ رسول اللہؐ سے سوال کیا گیا کون لوگ سب سے بہتر ہیں؟ فرمایا وہ جو خدا کی راہ میں مال وجان سے جہاد کرتے ہیں۔ پھر سوال کیا گیا، ان کے بعد کون لوگ بہتر ہیں؟ فرمایا وہ لوگ جو تنہا پہاڑوں پر رہتے ہیں اور اپنے رب کی عبادت کرتے دوسری روایت میں ہے کہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے۔

امام نووی: ریاض الصالحین، باب استحباب العزلۃ عند فساد الناس والازمان، بحوالہ بخاری ومسلم

ہے کہ دنیائی زندگی آخرت کی ابدی زندگی کے مقابلہ میں چند روزہ ہے۔ مزید یہ کہ دنیا کی زندگی دو اعتبار سے محدود ہے۔ ایک یہ کہ اس میں دین کے بہت سے حقائق کا مشاہدہ نہیں ہو سکتا، دوسرے یہ کہ اس میں اعمال کے پورے نتائج برآمد نہیں ہوتے ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ اس دوگونہ حقیقت کے نتیجہ میں دنیا کی زندگی ایک آزمائش ہے۔ چونکہ انسان کی آزمائش اس میں ہے کہ وہ زمین پر خدا کی خلافت کے فرائض انجام دے اس لئے دنیا کی بھلائی آخرت کی بھلائی کے لئے شرط لازم بن جاتی ہے۔ دنیا کی بھلائی سے بے اعتنائی آخرت کی فلاح کے امکانات ختم کر سکتی ہے۔

قرآن وسنت کے تیر میں جسم و روح دونوں کی رعایت ہے۔ بعد کے فکر نے جسم و روح اور مادی و روحانی خیر میں جو تضاد نمایاں کیا ہے، اس کی تائید قرآن مجید سے نہیں ہوتی جسی لذات اور روحانی مسرتیں دونوں ہی خیر کا جز ہیں۔ جسمانی لذتوں میں فی الحقیقت کوئی برائی نہیں ہے۔ دنیا فی نفسہ نہ بھلی ہے اور نہ بُری، اس کی بھلائی اور بُرائی اس طریقۂ زندگی پر منحصر ہے۔ جسے انسان اختیار کرتا ہے۔ مسیحیت کا یہ تصور کہ زمین پر انسان کا ورود سقوط کے ہم معنی ہے اور گناہِ اوّل کی سزا ہے۔ اسلامی عقیدے کے منافی ہے۔ قرآن مجید حیات دنیا کی تعمیر و اصلاح کو سعادت کا لازمی جز قرار دیتا ہے۔ اسلام میں نہ ترکِ دنیا کی کوئی گنجائش ہے اور نہ ہی دنیا کی لذتوں سے بالکلیہ دست کش ہونا جائز۔ قرآن مجید نے رہبانیت کو بدعت قرار دیا ہے[۳] اور رسول اللہؐ نے اسے اسلام سے خارج قرار دیا ہے۔ "لا رھبانیۃ فی الاسلام"۔[۴]

قرآن وسنت نے جو آئیڈیل پیش کیا ہے اس میں انسانی شخصیت کے کسی جز کی نفی نہیں کی گئی ہے۔ عقل و وجدان، ذوق وتخیل، جذبہ و احساس، سب کو اس کے صحیح مقام پر رکھا گیا ہے۔ اگرچہ افراد کی زندگیوں میں ان عناصر کی اضافی اہمیت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ لیکن انفرادی حالات وصلاحیتوں کی رعایت کے باوجود اسلام نے یہ کبھی پسند نہیں کیا کہ ایک جز کو دوسرے جز پر قربان کر دیا جائے۔ یا زندگی کے ایک پہلو کو اس قدر ابھارا جائے کہ دوسرا پہلو کچل کے رہ جائے۔ خدا کے رسولؐ نے اس امر کی طرف خصوصی توجہ فرمائی ہے کہ آپؐ کے اصحاب زندگی کے کسی پہلو کو ایک خاص حد سے

---

[۳] قرآن مجید (۲۷ : ۵۷)   [۴] مسند دارمی : باب النکاح

زیادہ نہ دبائیں ؎ اسلامی آئیڈیل میں جذبہ اور عمل، فکر اور احساس، روح اور جسم کا ایک حسین امتزاج ہے۔ مثال کے طور پر محبت کو لیجیے اسلامی آئیڈیل میں حب الٰہی کو جو بلند مقام حاصل ہے وہ ظاہر ہے مگر جس محبت کی تعریف قرآن و سنت میں آئی ہے وہ نرا جذبہ ہی نہیں ہے بلکہ وہ قوت ہے جو ان گوناگوں اعمال کی محرک ہوتی ہے جو اسلام کو پسند اور مطلوب ہیں۔

قرآن و سنت نے ہمہ جہتی شخصیت کا جو آئیڈیل پیش کیا ہے، اس میں اور مخصوص انفرادی صلاحیتوں اور رجحانات کی تکمیل میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اسلام میں شخصیت کا ایسا بے لچک تصور نہیں ہے جس کی ہو بہو نقل ہر شخص سے مطلوب ہو۔ حضرت ابوبکر و عمر، ابو ہریرہ و ابوذر، خالد و علی، عثمان ابن عفان و عبدالرحمٰن بن عوف، ابن مسعود و ابن عباس، عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہم کی شخصیتوں میں اگرچہ بنیادی یکسانیت ہے لیکن اس کے باوجود ہر ایک کی قوتیں اور صلاحیتیں، مشاغل و رجحانات، عادات و اطوار مختلف ہیں بلکہ بسا اوقات ایک دوسرے سے متضاد ہیں ؎۔ خدا کے رسول کو انفرادی قوتوں اور رجحانات کی اہمیت کا بخوبی احساس تھا۔ اسی حقیقت کے پیش نظر آپؐ نے یہ فرمایا :- اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم (میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں ان میں سے جس کسی کی روش تم اختیار کرو گے راہِ راست پر رہو گے) افراد کو فرداً فرداً اس ارشاد کو پیش نظر رکھنا چاہیے، لیکن اگر کوئی سماج بحیثیت مجموعی کسی ایک صحابی یا ایک جماعت صحابہ کو اپنا آئیڈیل بنا لے اور دوسروں سے صرف نظر کرلے تو وہ راہِ راست سے ہٹ جائے گا۔ کیونکہ خدا کے رسول کے علاوہ کسی کی زندگی بہر نوع جامع

؎ امام نووی نے اعتدال و توسط کے ذیل میں بہت سی حدیثیں پیش کی ہیں۔ ریاض الصالحین باب الاقتصاد فی الطاعۃ۔

؎ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بڑے صائب الرائے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف دینی، سیاسی اور سماجی مسائل میں ان سے مشورے کرتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ اور ابوذر رضی اللہ عنہما اپنے زہد و فقر کے لئے مشہور تھے۔ حضرت علیؓ اور خالدؓ اسلام کے بہترین قائدین جیش تھے۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ ابن عوف اپنی ثروت اور خدمت اسلام میں فائق تھے۔ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس علم و تفقہ میں ممتاز تھے۔ حضرت عائشہؓ بھی دینی علم و بصیرت میں مشہور تھیں۔

؎ مشکوٰۃ، باب مناقب الصحابہ۔

نہیں ہے۔ سماج کو تو پوری جماعت صحابہ کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

مسلمان کی زندگی ذمہ داری اور جواب دہی کے ایک گہرے احساس سے سرشار ہوتی ہے۔ یہ عقیدہ کہ ہر فرد کو جسم و دماغ کے ہر فعل کے لئے خدا کے سامنے جواب دہ ہونا ہے۔ اس کے شعور پر حاوی رہتا ہے جس کے نتیجے میں اس کی پوری زندگی خواہ وہ ذاتی ہو یا سماجی، ایک فریضہ بن جاتی ہے۔ مگر مسلمان اس فریضہ کو خارج سے ڈالا ہوا ایک بار نہیں سمجھتا بلکہ یہ تو اس کے داخلی احساس ذمہ داری کی ترقی یافتہ اور فعال صورت ہے۔ جو انسان کو دوسرے جانوروں سے ممتاز کرتی ہے، ناممکن ہے کہ ذمہ داری اور جواب دہی کا یہ گہرا شعور اسلام کے تصور خیر کو متاثر نہ کرے۔

خدا کے ساتھ انسان کا تعلق اگرچہ بہت وسیع ہے لیکن اس تعلق کا ایک مخصوص پہلو بھی ہے جس میں نماز اور دعا، ذکر و فکر وغیرہ اعمال شامل ہیں۔ زندگی کے آئیڈیل میں عام انسانی اخلاق کے علاوہ تعلق باللہ کا یہ مخصوص پہلو بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انسان ابتدا میں تعلق باللہ کے مختلف طریقے اخلاقاً واجب سمجھ کر اختیار کرتا ہے مگر روحانی ترقی کی بلند منزلوں میں یہ طریقے اور اعمال تقاضائے طبیعت بن جاتے ہیں اور جواب دہی اور خوف کی جگہ ارادت و محبت لے لیتے ہیں۔

قرآن و سنت کے اخلاق کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں ہمیں اخلاق کے متعین اصول و ضوابط ملتے ہیں۔ انسان سے یہ مطلوب ہوتا ہے کہ وہ ان اصولوں کی پابندی کرے۔ بظاہر اسے اخلاق کا فقہی تصور کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اسلامی اخلاق اس تصور سے بہت مختلف ہے۔ اسلامی اخلاق میں فرد کا محض یہ کام نہیں ہے کہ وہ قرآن و سنت کے اخلاقی احکامات حفظ کرلے اور بغیر غور و فکر کئے انہیں جوں کا توں اپنے حالات پر منطبق کر دے۔ قرآن و سنت میں عموماً جو اخلاقی اصول و ضوابط ملتے ہیں وہ بہت عام ہیں مثال کے طور پر:

انّ اللہ یأمر بالعدل والإحسان	بے شک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان اور اہل
وایتاء ذی القربیٰ وینھیٰ عن الفحشاء	قرابت کو دینے کا حکم دیتا ہے اور فحش، منکر
والمنکر والبغی۔ (۱۶:۹۰)	اور ظلم سے منع کرتا ہے۔

اس ہدایت پر عمل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان کو مثلاً یہ معلوم ہو کہ عدل کے کیا معنی ہیں۔ اگرچہ انسان کو عدل کے مفہوم کے تعین میں قرآن و سنت سے بیش قیمت ہدایت ملے گی۔ لیکن بدلتے ہوئے

حالات میں عدل کے تقاضے معلوم کرنے کے لئے ہمیشہ غور و فکر کی ضرورت پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ ضرورت زندگی کے ارتقاء اور نئے نئے حالات کے ظہور سے بڑھتی ہی چلی جائے گی۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیئے کہ کسی موقع پر صحیح طرز عمل متعین کرنے کے لئے عموماً کسی ایک اصول سے منطقی استنباط کرنے کا مسئلہ نہیں ہوتا بلکہ مختلف اصولوں کے تقاضوں کو تولنا اور ان کے نتائج کو پرکھنا اور جانچنا پڑتا ہے

کسی موقع پر صحیح طرز عمل متعین کرنے کے لئے نتائج اور عواقب کو ملحوظ رکھنا قرآن و سنت سے ثابت ہے۔ قرآن مجید کی یہ آیت مثلاً اس اصول کی نشان دہی کرتی ہے:

ولا تجعل یدك مغلولة	نہ تو اپنا ہاتھ گردن ہی سے باندھ لینا چاہیئے
إلى عنقك ولا تبسطها كل البسط	اور نہ ہی بالکل کھول دینا چاہیئے تاکہ پچھتانے
فتقعد ملوماً محسوراً۔ (۱۷: ۲۹)	اور تہی دست ہونے کی نوبت نہ آئے۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ متوقع نتائج کی سنگینیت حرام کے ارتکاب کو جائز قرار دے دیتی ہے جیسا کہ بعض شدید حالات میں لحم خنزیر یا شراب کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے یا جیسا کہ قتل ناحق کو روکنے کے لئے غلط بیانی کی یا دوسروں کو شر سے محفوظ رکھنے کے لئے غیبت کی یا روایات کی صحت معلوم کرنے کے لئے تجسس کی یا باہمی تعلقات کی اصلاح کے لئے کذب کی اجازت دی گئی ہے۔ ؎

قرآن و سنت کی نظر میں وہ عمل صائب نہیں ہے جو اس کی ہدایات کے بظاہر مطابق ہو بلکہ اس عمل کا محرک بھی صحیح ہونا ضروری ہے" انما الاعمال بالنیات" مشہور حدیث ہے۔ وہی اعمال حقیقت میں صائب اور حسن ہیں جو خدا کی رضا کے لئے کئے جائیں لیکن اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ اگر نیت درست ہو تو اعمال بھی لازماً صحیح ہوں گے۔ نیت کی صحت کے ساتھ عمل کا اخلاقی اصولوں کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ اس دوسری شرط کی ایک شق یہ بھی ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، کہ عمل اپنے نتائج اور عواقب

؎ اضطرار کی حالت میں لحم خنزیر کے استعمال کی اجازت قرآن مجید میں ہے (۶: ۱۴۶، ۵: ۳، ۲: ۱۷۳) شراب کے استعمال کی اجازت فقہ کا مشہور مسئلہ ہے۔ ناحق قتل سے بچانے کے لئے جھوٹ بولنے کی اجازت کے لئے ملاحظہ ہو امام غزالی: احیاء العلوم، دار الکتب العربیۃ الکبری، مصر، ۳: ۱۱۹ اور امام نووی: ریاض الصالحین، باب بیان ما یجوز من الکذب۔ غیبت کے جائز مواقع کے سلسلے میں ملاحظہ ہو ریاض الصالحین: باب بیان ما یباح من الغیبۃ۔

کے اعتبار سے صائب اور حسن ہو۔ رضائے الٰہی کے صحیح معنی اور عام اخلاقی محرکات سے اس کا تعلق وغیرہ ایسے سوالات ہیں جو اگرچہ قرآن وسنت کے اخلاقی نظریہ کے فہم کامل کے لئے نہایت ضروری ہیں مگر ان پر گفتگو کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

اعمال کی ذمہ داری کے بارے میں قرآن مجید کا نظریہ قابل تحقیق ہے۔ اشاعرہ کسی فعل حسن کے سلسلے میں انسان کو اس لئے ذمہ دار سمجھتے ہیں کہ شرع نے اس کے کرنے کا حکم دیا ہے۔ معتزلہ انسان کو اس لئے ذمہ دار قرار دیتے ہیں کہ یہ عقل کا حکم ہے۔ دونوں گروہوں کے نظریات ان کے مابعد الطبیعاتی اور دینی تصورات سے اس قدر مربوط ہیں کہ آزادانہ طریقے سے اس سوال پر قرآن وسنت کا موقف متعین نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بظاہر قرآن مجید کی آیات دونوں ہی خیالات کی تائید کرتی ہیں اور غالباً صحیح نظریہ ان دونوں نظریات کا امتزاج ہوگا۔ ایسی آیات تو بے شمار ہیں، جن میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں اور فلاں عمل کو واجب قرار دیا ہے۔ اور فلاں فلاں عمل اور شئے کو حرام کر دیا ہے۔ دوسرے نظریہ کی تائید میں یہ آیت بہت واضح ہے۔ "ولا اقسم بالنفس اللوامة" (۷۵ : ۲) نفس لوامہ یا ضمیر کے وجود کی تصدیق سے یہ بات لازم آتی ہے کہ انسان کے اندر ایک قوت ایسی ہے جو نہ صرف شر کے ارتکاب پر ملامت کرتی ہے بلکہ خیر کا حکم بھی دیتی ہے۔ مذکورہ بالا آیت کے چند آیات کے بعد ہی یہ آیت ملتی ہے "بل الانسان علی نفسه بصیرة ولو القیٰ معاذیره" (انسان اپنے نفس پر آپ سمجھ بوجھ رکھتا ہے۔ اگرچہ وہ اپنے اوپر طرح طرح کے بہانوں کے پردے ڈال لیتا ہے)

خیر و شر صائب و غیر صائب کے علم کے بارے میں بھی قرآن مجید کا نقطۂ نظر اشاعرہ اور معتزلہ کے نظریات کے درمیان معلوم ہوتا ہے۔ حسن وقبح کے علم کا انحصار نہ تو محض شرع پر ہے اور نہ عقل ہی ان کے ادراک کے لئے کافی ہے۔ قرآن وسنت کی واضح تعلیمات کی موجودگی میں اشاعرہ کے اس نظریہ کی تائید کی ضرورت نہیں ہے کہ بعض حسن وقبح کا علم شرع سے ہوتا ہے۔ مگر معتزلہ کی اس رائے کے حق میں کہ بعض حسن وقبح کا علم عقل سے ہوتا ہے صرف ایک آیت پیش کی جا رہی ہے:-

ونفس وما سوىها فالهمها	قسم ہے (انسان کے) نفس کی کہ اسے درست بنایا اور
فجورها وتقوىها	اس کی نیکی اور بدی الہام کر دی۔

ایک حدیث بھی اس نظریہ کی تائید میں بہت واضح ہے۔ :-

یا وابصة استفت قلبك واستفت نفسك البر ما اطمان الیه القلب واطمانت الیه النفس والاثم ما حاك فی صدرك وتردد فی النفس وان افتاك الناس۔

رسول اللہ صلعم نے فرمایا اے وابصہ! اپنے دل سے پوچھا کر اور اپنے نفس سے فتویٰ لیا کر۔ نیکی وہ ہے جس سے دل اور نفس میں طمانیت پیدا ہو اور گناہ وہ ہے جو دل میں کھٹکے اور نفس کو اُدھیڑ بن میں ڈال دے۔ اگرچہ لوگ تجھے اس کا کرنا جائز ہی کیوں نہ بتائیں۔

[مسند احمد ابن حنبل ۴ : ۲۲۸]

ان دونوں نظریات کی تطبیق کے لئے یہ حدیث قابل غور ہے :

ابن مسعود کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے ایک مثال بیان کی ہے۔ ایک راستہ سیدھا ہے اور اس کے دونوں طرف دیواریں ہیں اور دیواروں میں کھلے ہوئے دروازے ہیں، اور دروازوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اور راستہ کے سرے پر ایک داعی کھڑا ہوا ہے۔ جو پکار کر کہتا ہے سیدھے راستہ پر چلے جاؤ اِدھر اُدھر منہ نہ کرو۔ اور اس داعی کے علاوہ ایک اور داعی ہے۔ جب کوئی بندہ ان دروازوں میں سے کوئی دروازہ کھولنا چاہتا ہے تو دوسرا داعی پکار کر کہتا ہے کہ افسوس ہے تجھ پر اس کو نہ کھول اگر تو اس کو کھولے گا اس کے اندر داخل ہو جائے گا۔" یہ مثال بیان کر کے رسول اللہ صلعم نے اس کی تفسیر اس طرح فرمائی۔ سیدھا راستہ تو اسلام ہے اور دیواروں کے دروازوں سے مراد وہ چیزیں ہیں، جنہیں خدا نے حرام قرار دیا ہے اور ان کے پردوں سے مراد اللہ کے حدود ہیں اور وہ داعی جو راستے کے سرے پر کھڑا ہے قرآن ہے اور وہ دوسرا داعی اللہ کا واعظ ہے جو ہر مومن کے دل میں موجود ہے۔ [مشکوٰۃ : باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ بحوالہ احمد، ترمذی، اور بیہقی]

انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے، اس حقیقت کی وضاحت مختلف آیات میں کی گئی ہے:

کل نفس بما کسبت رهینة۔ [۴۰ : ۱۷]

ہر شخص اپنے اعمال کے بارے میں ماخوذ ہوگا۔

الیوم تجزی کل نفس بما کسبت لا ظلم الیوم ان اللہ سریع الحساب [۴۰ : ۱۷]

آج ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلا دیا جائے گا۔ آج (کسی پر) کوئی ظلم نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔

انسانی ذمہ داری کے اس نظریہ کے خلاف بعض گروہوں نے قرآن مجید کی وہ آیات نقل کی ہیں۔ جن میں خدا کی غیر محدود قدرت کا ذکر آیا ہے، مگر اس سلسلے میں دو باتیں پیش نظر رہنی چاہئیں۔ یہ خیال کہ اللہ تعالیٰ کی غیر محدود قدرت والی آیات انسانی ذمہ داری کی تائید کرنے والی آیات سے متضارب ہیں، زیادہ سے زیادہ ایک استخراجی نتیجہ ہے۔ قرآن مجید نے اعمالِ انسانی کی ذمہ داری کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کی ہے۔ دوسری بات یہ کہ جب کبھی انسانوں نے اپنے اعمالِ بد کی ذمہ داری خدا پر ڈالی ہے اور اس کے لئے خدا کے غیر محدود علم و قدرت کا سہارا لیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس فعل کو ظن و تخمین اور افترا ہی قرار دیا ہے۔

سیقول الذین اشرکوا لو شاء اللہ ما اشرکنا ولا آباؤنا ولا حرمنا من شیئ کذلک کذب الذین من قبلھم حتیٰ ذاقوا بأسنا قل ھل عندکم من علم فتخرجوہ لنا ان تتبعون الا الظن وان انتم الا تخرصون۔ [۶ : ۱۴۹]	جن لوگوں نے شرک کا ڈھنگ اختیار کیا ہے وہ کہیں گے اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا شرک نہ کرتے اور نہ کسی چیز کو (اپنی رائے) سے حرام ٹھہراتے سو (دیکھو) اسی طرح ان لوگوں نے بھی (سچائی کو) جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں یہاں تک کہ انہیں (بالآخر) ہمارے عذاب کا مزہ چکھنا پڑا (اے پیغمبر) تم کہو کہ کیا تمہارے پاس علم کی روشنی ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکتے ہو؟ اصل یہ ہے کہ تم پیروی نہیں کر رہے ہو مگر وہم اور اٹکل کی اور تم اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو کہ بے سمجھے بوجھے باتیں بنانے والے ہو۔

قرآن و سنت کے اخلاق کے یہ چند بنیادی نکات ہیں۔ رسول خدا کی زندگی اس آئیڈیل کی کامل تصویر تھی۔ آپ نے قرآن مجید کے اخلاقی اصولوں کو زندگی کے سارے شعبوں میں نافذ فرمایا۔ ذاتی زندگی ہو یا سماجی، قومی مسائل ہوں یا بین الاقوامی آپ نے ان اصولوں پر ان کی نئی تشکیل کی۔ وہ افراد جو آپ کی رہنمائی اور تربیت میں اس عظیم اخلاقی تجربے سے گزرے ان کے اندر ایک تیز اخلاقی بصیرت پیدا ہو گئی جس کو اگرچہ اپنے نظریاتی مفروضات اور مضمرات کا بخوبی شعور نہ تھا لیکن وہ ایک طویل عرصہ تک زندگی کی اسلامی تشکیل کے لئے کافی ثابت ہوئی۔